© rasailojaraid.com

یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی

ایک جائزہ

سلطان احمد اصلاحی

عیسائیت کبھی بھی فکر و نظر کا کوئی مکمل نظام نہیں رہی جس کی بنیاد پر سماج کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کی جا سکے۔ قوم یہود کے اندر جو زرپرستی اور دنیا طلبی پیدا ہو گئی تھی، اس کے علماء و رہبان جس طرح روح شریعت کو چھوڑ کر اس کے الفاظ سے کھیلنے لگے تھے اور اپنے دینی منصب کو کلیۃً جلب دنیا کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا، حضرت مسیح، ایک عارضی وقفے کے لئے انہی کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے، جس کی صراحت وہ خود ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" (متی باب ۱۵: ۲۴)

آں جناب کی ان تعلیمات و ہدایت سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کی بعثت خاص قوم یہود کے لئے ہوئی تھی۔ اور آپ کی تمام تر کوششیں ان کے بگاڑ کو دور کرنے اور انھیں راہ راست پر لگانے پر مرکوز رہیں۔

"تم سن چکے ہو کہ تم سے کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور جو کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔" (متی: باب ۵: ۳۸-۴۲)

"لیکن میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو جو تم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لیئے برکت چاہو۔ جو تمہاری تحقیر کریں ان کے لیئے دعا کرو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتا لینے سے بھی منع نہ کر، جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر۔

(لوقا باب: ۶: ۲۷ تا ۳۰)

"مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر نا امید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ٹھہرو گے کیونکہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے، جیسا تمہارا باپ رحیم ہے تم بھی رحم دل ہو"۔ (ایضاً: ۳۵، ۳۶)

قوم یہود جسے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت تک کے لیئے امامت عالم کے منصب پر فائز کیا تھا اور اسے اپنے بے پایاں احسانات سے نوازا تھا، اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیئے تورات کی صورت میں ایک جامع مجموعۂ قوانین عطا کیا تھا۔ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ——— اس کے اندر خرابی اور بگاڑ کی جو صورتیں پیدا ہوئیں اس کا نمایاں ترین مظہر اس قوم کا فقہی جمود تھا۔ چنانچہ اس نے روحِ شریعت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے ظاہر کو سب کچھ سمجھ لیا، بیجا لفظی موشگافیاں کر کے خدائی شریعت کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اور احکام کے حقیقی منشاء کے علی الرغم ان کا ہیولیٰ ہی بالکل بدل کر رکھ دیا جس کے نتیجہ میں وہ بے شمار ان جکڑبندیوں میں پھنس گئے جن کا خدائی مرضی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور بہت سی ان بندشوں سے وہ آزاد ہو گئے جن کا الٰہی شریعت انھیں پابند دیکھنا چاہتی تھی۔ قوم یہود کے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی حضرت مسیحؑ کی بعثت توراتی شریعت میں پیدا ہو جانے والے اسی عدم توازن کو دور کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اور آپ کو ملنے والے مجموعۂ احکام "انجیل" کی امتیازی حیثیت ہی یہ تھی کہ وہ اس قوم اور خاص کر اس کے علماء و رہبان کی ظاہر پرستی کو ختم کر کے ان کے اندر روحِ شریعت کی پیروی کے جذبہ کو بیدار کرے۔ عہد نامۂ جدید کا درج ذیل بیان اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ حضرت مسیحؑ اپنی قوم کے فقیہوں اور فریسیوں کی حالت زار پر ماتم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم بیواؤں کے گھروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھا دے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو۔" (متی باب ۲۳:۱۴)

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سولف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے، اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو"۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔"

(ایضاً: آیات ۲۳ تا ۲۸)

"پھر اس نے اپنی تعلیم میں کہا کہ فقیہوں سے خبردار رہو جو لمبے لمبے جامے پہن کر پھرنا اور بازاروں میں سلام، اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور ضیافتوں میں صدر نشینی چاہتے ہیں۔ اور وہ بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہیں اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہیں۔ ان ہی کو زیادہ سزا ملے گی

(مرقس باب ۱۲: ۳۸-۴۰)

لیکن سانحہ یہ پیش آیا کہ قوم یہود کی عظیم اکثریت نے حضرت مسیحؑ کا انکار کیا۔ اور اپنے کو انجیل سے بالکل بے تعلق کر لیا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے آں جنابؑ کی پیروی اختیار کی وہ آپ کے حکم اور مرضی کے علی الرغم دوسری انتہا پر جا پہونچے کہ انھوں نے انجیل ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور "توراۃ" کے منکر ہو گئے۔ جبکہ اصل صورت یہ تھی کہ توراۃ اور انجیل دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی تھیں۔ اس دوگونہ مجموعۂ شریعت کی پیروی ہی میں اہل کتاب کی نجات مضمر تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسی کے ذریعہ وہ زندگی میں جادۂ اعتدال پر قائم رہ سکتے تھے۔ اہل تورات جس فقہی جمود اور لفظی جکڑ بندیوں کے گرداب میں پھنس گئے تھے انجیل کے بغیر وہ اس سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح انجیل میں حکمت وموعظت اور روح شریعت کی بھرپور تشریح وتفصیل تو تھی لیکن توراتی مجموعۂ قانون کے بغیر اس کے لئے زندگی کی گاڑی کو زیادہ دور تک اعتدال وتوازن کے ساتھ چلانا بہت مشکل تھا۔ لیکن تفصیلات سے قطع نظر ہوا یہی کہ انجیل تورات سے کٹ گئی۔ اور جس طرح اہل کتاب کے لئے انجیل سے روگردانی کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ وہ روح شریعت سے عاری ہو کر نری ظاہر پرستی اور دنیا طلبی اور جلب منفعت میں لگ گئے۔ پیروان مسیحؑ کے لئے توراۃ کے انکار کا انجام یہ ہوا کہ ان کے پاس ایک بالکل کٹی پھٹی شریعت باقی رہ گئی جو واقعہ ہے کہ سماج کی تعمیر اور انسانی آبادی کے مسائل کے حل کی عظیم ذمہ داری سے کسی بھی صورت عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہوا کہ حضرت مسیحؑ کی وفات پر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۳۲۵ء کی نیسیا کی کونسل میں مسیحیت[1] پر پال کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں اس کی صورت ہی مسخ ہو گئی۔ توراۃ سے کٹ جانے کے سبب اس کے اندر پیدا ہو جانے والی مذکورہ خامی اور کمی سے قطع نظر اس کی ہم آہنگی بالکل خاک میں مل گئی اور وہ تضادات کا ایک مجموعہ بن کر رہ گئی۔[2] یہی وجہ ہے کہ عہد نامۂ جدید میں اگر حضرت مسیحؑ ایک طرف اپنے پیرودں کو اس دعا کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ آسمان کی طرح زمین پر بھی خدا کی بادشاہت قائم ہو!

---

[1] یہاں ہم مسیحیت کو مسیحیت اسی پہلو سے کہہ رہے ہیں جیسا کہ اس کے ماننے والوں نے اسے توراۃ اور اسی طرح اسکے بعد آنے والی شریعت محمدیؐ سے کاٹ کر اسے ایک الگ اور مستقل شریعت کا درجہ دے لیا۔ اور جیسا کہ وہ آج عہدنامۂ جدید کے صفحات میں نظر آتی ہے۔ ورنہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نہ یہودیت کوئی چیز ہے نہ مسیحیت۔ یہ سب اسی دین حنیف، اسلام کی مختلف شکلیں ہیں جس کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہوتا ہے۔ دوسری بے شمار قوموں اور جماعتوں کی طرح یہ اہل کتاب کی محض نادانی اور ناسمجھی ہے کہ انھوں نے اس دین قدیم کی صورت بگاڑ کر اسے یہودیت اور مسیحیت کے خانوں میں بانٹ دیا۔ اور اسکے نتیجے میں قیامت تک کے لئے باہم کٹتے مرتے رہنے کی راہ ہموار کر لی۔ [2] واضح رہے کہ عہد نامۂ جدید (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"۔ (متی باب: ٦: ٩-١٠)

تو دوسرے مقام پر ہمیں ان کا یہ اعلان پڑھنے کو ملتا ہے۔

"میری بادشاہی اس دنیا کی نہیں"۔ (یوحنا باب: ١٨: ٣٦)

اس سے بھی آگے دوسری جگہ وہ صاف طور پر دین و دنیا کی تقسیم کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔

"پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو"۔ (متی باب ٢٢: ٢١)[1]

اس کے علاوہ عہد نامۂ جدید حکومت وقت کی پیروی کو بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس روش پر عمل پیرا ہے اور اس کا انداز کیا ہے، پیروانِ مسیح کے لئے لازم قرار دیتا ہے:

"ہر شخص اعلیٰ حکومتوں کا تابعدار رہے، کیونکہ کوئی حکومت ایسی نہیں جو خدا کی طرف سے نہ ہو اور جو حکومتیں موجود ہیں خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ پس جو کوئی حکومت کا سامنا کرتا ہے وہ خدا کے انتظام کا مخالف ہے اور جو مخالف ہیں سزا پائیں گے"۔

(رومیوں کے نام پولس رسول کا خط باب ١٣: ١-٢)

اس تاکید کے ساتھ کہ:

"سب کا حق ادا کرو جس کو خراج چاہئے خراج دو جس کو محصول چاہئے محصول جس سے ڈرنا چاہئے اس سے ڈرو۔ جس کی عزت کرنا چاہئے اس کی عزت کرو"۔ (ایضاً: آیت ٧)

اپنی موجودہ صورت میں بڑی حد تک پولوس کی اپنی تحریروں پر مشتمل ہے اور باقی صحائف میں بھی جو کچھ ہے وہ انہی خیالات کی تائید میں ہے جو پولوس نے پیش کئے۔ ستائیس صحائف پر مشتمل یہ عہد نامہ جناب یسوع علیہ السلام کے ٣٢٥ سال بعد اس اجتماع کی کثرتِ رائے سے منتخب کیا گیا تھا جس کی اکثریت تثلیث اور اسی طرح کے دوسرے مشرکانہ تصورات کی قائل تھی۔ یہ فیصلہ نیسیہ (Nicaea) کی اسی مذکورہ کونسل کا تھا (عبدالوحید خاں: عیسائیت انجیل اور قرآن کی روشنی میں صفحہ ١٠١)

[1] نیز ملاحظہ ہو: مرقس باب ١٢: ١٧، لوقا باب: ٢٠: ٢٥

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رومن ایمپائر کو پال (Paul) کی قائم کردہ اسی مسیحیت کا تجربہ ہوا[1]۔ اور چوتھی صدی عیسوی میں وہ اس کا سرکاری مذہب قرار پاگئی۔ پانچویں صدی عیسوی میں حالات کی گردش سے رومن ایمپائر کے زوال کے بعد فطری طور پر اس کی وراثت اس کے حصے میں آئی۔ اپنی ان محدودیتوں اور کمیوں کے پیش نظر جن کا ابھی ذکر ہوا۔ مسیحیت کے لئے مناسب تو یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ، چھوٹے اور مختصر دائروں میں انسانی زندگی کے مسائل کے حل میں اپنے کو لگاتی، حکومت و سلطنت کے جھمیلوں سے اپنے کو بالکل دور رکھتی لیکن مسیحیت کے علمبرداروں کے لئے، جن کی نگاہیں رومن امپائر کی زبردست شان و شوکت کے سامنے خیرہ ہو چکی تھیں، اس کا سہارنا اور کمتر دائرے پر اپنے کو قانع بنانا ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس کے بعد ذرا تاخیر کئے بغیر کلیسا نے اپنے کو رومی شاہنشاہی کے ڈھنگ پر منظم کرنا شروع کر دیا[2]۔ اور آٹھویں اور نویں صدی تک تو وہ پوری طرح کھل کر میدان میں آگیا۔ لیکن جیسا کہ اشارہ کیا گیا پال کی مسیحیت اپنی محدودیت اور اپنے داخلی تضادات کے ساتھ حکومت و سلطنت کے لئے کوئی کامل اور ہم آہنگ نظام عمل عطا کرنے سے قاصر تھی، چنانچہ قطع نظر ان بے شمار ادارہ جاتی اور شعبہ جاتی امور و مسائل کے جن میں اس کا نمائندہ کلیسائے روم بری طرح رومن ایمپائر سے متاثر رہا اور بے چون و چرا اور بلا تامل انھیں اپنے ہاں اپنا تا گیا[3]۔ اس صورت حال نے سرزمین یورپ میں اسی وقت سے چرچ اور اسٹیٹ بالفاظ دیگر مذہب اور ریاست کا جھگڑا کھڑا کر دیا کہ اقتدار کا اصل سرچشمہ کون ہے پاپائے روم یا وقت کے

---

[1] Carl Stephenson : Mediaeval History . Re. E. P. 38

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ یورپ حصہ اول : مصنفہ الیور تھیچر، ترجمہ مولوی عبدالماجد بی۔اے، نواب صدر یار جنگ بہادر اور قاضی تلمذ حسین۔ صفحات ۱۷۹، ۱۸۰ نیز D.R. Bhandari : History of European Political Philosophy P. 69-70

[3] مثال کے طور پر بے دینی کو رائج الوقت بغاوت (Treason) پر قیاس کر کے اسے خدا کے خلاف بغاوت (Treason against God) قرار دیتے ہوئے کلیسائے روم نے ایذا رسانی (Torture) کا اصول رومی قانون سے اخذ کیا تھا، اسی طرح بے دینوں کی تمام جائداد کو ضبط کر لینے کا قاعدہ بھی اسی رومی قانون سے اخذ کردہ تھا ملاحظہ ہو: History of Torture Throughout the Ages P. 53

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیکولر حکمراں ؟ جس کا سلسلہ آگے ہزار سال یعنی سترہویں اور اٹھارویں صدی تک جاری رہا جب کہ مختلف انقلابات کے نتیجے میں کلیسائی اور شاہی بساط الٹ کر دستوری حکومتیں وجود میں آتی ہیں جن کے اندر کھلے لفظوں میں مذہب کی معاملات دنیا سے بے دخلی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور یورپ اطمینان کا سانس لیتا دکھائی دیتا ہے کہ اب آئندہ اسے مذہب کے نام پر ظلم و استبداد کے شکنجے میں نہ کسا جاسکے گا۔ زمانۂ مابعد میں اسی کی تقلید میں دنیا کے مختلف خطوں سے مذہب کی معاملات دنیا سے بے دخلی کی بات ہمارے سننے میں آتی ہے۔

چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی

آج یورپ نے اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ مذہب کا معاملات دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اسی کے اثر سے دنیا کے بیشتر خطوں میں بھی اسے ایک مقبول عام تصور کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ زیادہ دور نہیں ابھی اٹھارویں صدی کے اختتام تک صورت یہ تھی کہ وہاں 'بادشاہ برضئی خدا' (Kings by the grace of God) اس لقب کے بغیر بادشاہوں کا نام لینے کی بھی کسی کی ہمت نہ تھی۔ اگلے زمانوں کی بات اپنی جگہ اسی اٹھارویں صدی میں فرانس کے لوئیس چہاردہم (Louis XIV)[1] اور انگلینڈ کے جیمس دوم (James II) نے 'مرضی خدا' (The grace of God) کو ایک سیاسی عقیدے کے طور پر اپنایا اور اس کی بدولت اپنی کلیت پسندی (Absolutism) کے لئے وجہ جواز پیدا کیا جس کی رو سے دیگر تمام انسانی حقوق مثلاً دولت، خاندان، پارلیمنٹ وغیرہ کی طرح 'بادشاہ کا یہ حق' بھی ابدی اور من جانب اللہ تھا۔ جسے کسی صورت چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح بادشاہ کی شخصیت عام انسانی قانون کے دائرے سے بلند قرار پائی تھی

---

[1] یہی نہیں بلکہ لوئیس بڑے فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتا تھا کہ: ہم شہزادے خدا کی زندہ تصویریں ہیں جو تمام تر پاک اور قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے: "We Princes are living images of Him who is all holy and all powerful. Bluntschli: The theory of the State P. 288

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد ایسا ہوا کہ فرانس کی عملداریوں (estates) نے اس تصور کو قبول کرنے سے انکار کیا اور برطانوی پارلیمنٹ نے نسبتہً اور سختی سے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ بالآخر انگلینڈ کے ۱۶۸۸ اور فرانس کے ۱۷۸۹ کے انقلابات کے نتیجے میں بادشاہوں کے اس تقدس اور ان کے من جانب اللہ ہونے کے تصور کو آخری طور پر مسترد کیا گیا۔[۱]

سرزمین یورپ میں عیسائیت کے قدم جمانے سے، کر اٹھارویں صدی کے اختتام تک یہ مسئلہ کبھی زیر بحث آیا ہی نہیں کہ "مذہب کا معاملاتِ دنیا سے کوئی تعلق ہے، نہ ہونا چاہئے بلکہ سچ یہ ہے کہ کسی بھی ایسے شخص کے لئے جو اپنے ہوش و حواس بالکل کھو نہ چکا ہو اس طرح کی بات اپنی زبان پر بھی لانے کی ہمت نہ تھی۔ اس وقت تک مذہب سے تعلق نہیں مذہب سے لاتعلقی، بے دینی، سب سے بڑا جرم تھی جس کا ارتکاب کرنے والا جس انجام بد سے دوچار ہوتا تھا اس کی کسی قدر تفصیل اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں[۲]۔ وہاں اگر جھگڑا رہا ہے تو اس کا کہ دنیا پر مذہب عیسائیت کی حکومت کس ادارے کے ذریعہ انجام پائے، چرچ اور پاپائیت کے ذریعہ یہ کام انجام پائے یا یہ ذمہ داری سیکولر حکمرانوں کے سپرد ہونی چاہئے۔ اور کہنا چاہئے کہ عہد جدید کی پوپھٹنے تک یورپ بری طرح سے اس کشمکش کا شکار اور اس اختلاف و نزع کی آماجگاہ رہا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ یہی آویزش و چپقلش ہمیں یورپ کی تاریخ کا سب سے نمایاں باب نظر آتی ہے۔ خاص طور پر قرون وسطی کے زمانہ میں تو ایسا لگتا ہے کہ وہاں اس ایک کام کے سوا دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا جس میں باشندگان یورپ کی قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہوتیں۔ جس کے لئے ان میں سے ہر فریق، کتاب مقدس سے غذا حاصل کرتا تھا جو اس کے لئے، جیسا کہ ابھی اوپر تفصیل گزری، اس مقصد کی خاطر بھرپور مواد فراہم کرتی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ میں بارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک "سیاسی تصور" کی کل دوڑ اس نشانے تک محدود تھی کہ

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو Bluntschli: The Theory of the States P.290-291

[۲] دیکھا جائے راقم کا مضمون "یورپ میں محکمہ احتساب عقائد کے ستم خوردوں پر ایک نظر" مطبوعہ تحقیقات اسلامی، شمارہ سوم ۸۳ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاپائیت کا یہ دعویٰ کہ شہنشاہیت پر اسے بالادستی حاصل رہے، درست ہے یا نہیں؟[۱]

خاص طور پر نویں صدی سے لے کر گیارہویں اور بارہویں صدی تک یہ لڑائی اپنے شباب پر تھی جس میں دونوں فریق اپنے اپنے حق میں الگ الگ دلائل فراہم کر رہے تھے۔ کلیسا جس بنیاد پر اپنے لئے اس حق کا مدعی تھا اس میں خاص بات یہ تھی کہ:-

۱۔ چونکہ پوری بنی نوع انسانی ایک ہے، اس لئے چرچ جس کی بنیاد براہ راست خدا (God) نے رکھی ہے، ریاست کی ذمہ داری بھی صحیح معنوں میں اسی کی ہو سکتی ہے۔ خدائی فرمان کے ذریعہ اسے یہ چیز حاصل ہوئی ہے، خدا جس کی ذات میں تمام دنیوی و روحانی اختیارات مرکوز ہیں۔ چونکہ یہ چیز قادر مطلق ذات کا اٹوٹ حصہ ہے اس لئے کسی صورت اس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اس ریاست کے سربراہ اصلاً تو حضرت مسیح (Christ) ہیں، لیکن چونکہ وہ بنفس نفیس اس دنیا میں موجود نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ زمین پر ان کا ایک نمائندہ ہو جو عام انسانوں پر ان کے اقتدار کو بحال رکھ سکے۔ جناب مسیح کا یہ نمائندہ پوپ (Pope) ہے جو بیک وقت لوگوں کا پادری (Priest) بھی ہے اور ان کا بادشاہ (King) بھی بادشاہ یعنی ان کا دنیوی اور روحانی شہنشاہ، ان کا قانون ساز (Law-giver) ان کا منصف (Judge) غرض یہ کہ وہ ہر پہلو سے سب سے بڑا اور زبردست ہے۔

۲۔ دونوں ہی تلواریں جن میں سے ایک روحانی اقتدار کی نمائندگی کرتی ہے، دوسری سیکولر اقتدار کی، انھیں پہلے تو خدا نے جو پیٹر (Peter) کو عطا کیا، اور اس سے منتقل ہو کر یہ خیر پوپ (Pope) تک پہنچی جو روئے زمین پر خدا کا نائب (Vicegerent of God) ہے۔ روحانی تلوار کو تو پوپ نے اپنے پاس باقی رکھا، البتہ دنیوی تلوار کو اس نے سیکولر حکمرانوں تک منتقل کر دیا۔ لیکن اس منتقلی کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ آزادانہ طور پر اس کے مالک ہو گئے ان کی زیادہ سے زیادہ حیثیت یہ ہے کہ یہ کلیسا کے وکیل اور اس کے معتمد علیہ (agent) ہیں۔ پوپ مالک تو دراصل بیک وقت روحانی اور سیکولر اختیارات دونوں کا ہے، البتہ عملاً

---

[۱] D.R. Bhandari: History of European Political Philosphy P. 86

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استعمال وہ اپنے روحانی اختیار ہی کا کرتا ہے۔ بادشاہ اور سیکولر حکمراں اپنے مناصب اور اپنے اختیارات بالواسطہ طور پر خدا (God) سے اور بلاواسطہ پوپ سے حاصل کرتے ہیں، اور اس بنا پر وہ اس کی رعایا (Vassals) ہیں۔ بس اتنا ہے کہ پاپا کی رعایا میں شہنشاہ کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔ اس کی تاج پوشی کی حلف برداری دراصل پوپ کو ایک طرح کا خراج عقیدت ہے۔ دنیوی اقتدار چونکہ چرچ کا عطا کردہ ہے اس لئے اس کا استعمال بھی چرچ کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے۔ پوپ کو اس کا اختیار حاصل ہے بلکہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ سیکولر حکمرانوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں رکھے۔ کسی تکلف کے بغیر وہ شہنشاہی اقتدار کو ایک شخص سے ہٹا کر دوسرے شخص تک منتقل کرسکتا ہے۔ اپنی اس حیثیت میں دراصل وہ بادشاہ گر یا بادشاہ کا انتخاب کنندہ (Imperial Elector) ہے۔ شہنشاہیت میں جب بھی کہیں خلا پیدا ہوگا، ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر اس کی نگرانی پوپ تک منتقل ہو جائے گی۔ پوپ کو اس کا بھی اختیار ہے کہ وہ عام حکمرانوں کے خلاف لوگوں کی شکایات کی سماعت کرسکے۔ انھیں معزول کردے اور ان کی رعایا کو ان کی وفاداری سے الگ قرار دیدے۔

۴۔ مادہ کے بالمقابل روح کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے فطری طور پر عوامی اقتدار کے مقابلے میں روحانی اقتدار زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور بجا طور پر اسے زیادہ عزت و احترام کا مقام حاصل ہونا چاہئے۔ چرچ روح کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ ریاست کو صرف اس کے قالب کی نمائندگی حاصل ہے۔ چرچ سورج (Sun) کے مانند ہے۔ ریاست کی حیثیت اس کے مقابلے میں چاند (Moon) کی ہے۔ اس بنا پر عوامی اقتدار (Kay authority) روحانی اقتدار سے مستعار ہے، اسی کے ذریعہ اسے قوت نافذہ ملتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کا تمام تر دارومدار اسی پر ہے۔[1]

اس کے برعکس سیکولر حکمراں اپنے لئے جس دلیل کی بنا پر اس حق کے دعوے دار تھے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو D.R. Bhandari, History of European Political Philosphy P.87.88.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں نمایاں بات یہ تھی کہ:

۱۔ سیکولر اقتدار چرچ کا تفویض کردہ نہیں بلکہ یہ چیز براہ راست خدا کی عطا کردہ ہے۔ بادشاہ روئے زمین پر خدا (God) کے نائب اور خلیفہ (Vicegerents) ہیں اور اس بنا پر وہ صرف اسی (Him) کے روبرو جوابدہ ہیں۔ ریاست کو اسی طرح من جانب اللہ (divine) ہونے کی سند حاصل ہے جیسی کہ چرچ کو ہے۔ اور اس بنا پر وہ چرچ کی تابع فرمان نہیں ہو سکتی ہے۔

۲۔ شہنشاہیت کے علمبردار (Imperialists) پاپائیت کی بالادستی سے اپنے کو آزاد رکھنے کے لئے خاص طور پر کتاب مقدس کو بنیاد بناتے تھے۔ اور عہدنامۂ قدیم و جدید ہر ایک سے اس سلسلے میں دلائل فراہم کرتے تھے۔ عہدنامۂ جدید سے بالخصوص وہ پال (Paul) کے اس قول کا حوالہ دیتے تھے جس کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ:

> "کوئی حکومت ایسی نہیں جو خدا کی طرف سے نہ ہو اور جو حکومتیں موجود ہیں، خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ پس جو کوئی حکومت کا سامنا کرتا ہے وہ خدا کے انتظام کا مخالف ہے۔"
>
> (Powers that be are ordained of God. Whoso ever, therefore, resisteth the power risisteth the ordinance of God.)

کتاب مقدس کے اسی طرح کے فرامین کی بنیاد پر سیکولر حکمرانوں کا رعایا سے مطالبہ تھا کہ وہ ان کی غیر مشروط وفادار رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا کی طرف سے مقرر ہونے کے سبب سے وہ صرف خدا (God) کے حضور جوابدہ ہیں۔ اور اس بنا پر وہ پاپائیت کے اختیار سے بالکل آزاد ہیں۔ اور ان کے اوپر اسے کسی قسم کا اثر و اقتدار دکھانے کا حق نہیں ہے[1]۔

اس مرحلے پر جن لوگوں نے مختلف تشریحات کے ساتھ کلیسا کی حمایت کی ان چند خاص نام یہ ہیں ہیلڈ برانڈ یا گریگوری ہفتم (Hildebrand or Gregory VII 1073-1080)

---

[1] حوالہ سابق صفحہ ۹۱-۹۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سینٹ برنارڈ (St. Bernard (1091 - 1153) مین گولڈ (Manegold) جان آف سیلسبری (John of Salisbury(1115 - 1180) سینٹ ٹامس ایکوئنس (St. Thomas Aquinas (1227- 74) اور آگسٹس ٹرمفس (Augustus Triumphus). اس کے بالمقابل سیکولر حکمرانوں کی تائید میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں قابل ذکر یہ لوگ تھے مارسگلو آف پڈوا (Marsiglo of Padua (1270 — 1340)' ولیم آف اوک ہام William of Ockham (1290-1347) اطالوی فلسفی دانتے (Dante) اور پیرے ڈیوبیس (Pierre Dubois)[1] جن کے استدلال میں علاوہ اور چیزوں کے حضرت مسیح کا یہ قول بھی شامل تھا کہ "میری بادشاہی اس دنیا کی نہیں (My Kingdom is not of this world)[2] پاپائیت کے علمبرداروں اور سیکولر حکمرانوں کے ہمنواؤں کی یہ لڑائی کیسی شدید تھی اس کا اندازہ آپ صرف اس سے کر سکتے ہیں کہ صرف گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یعنی ۱۰۵۲ء سے ۱۱۱۲ء کے عرصے میں اپنے اپنے موقف کی حمایت میں فریقین کی طرف سے ایک سو پندرہ ۱۱۵ کتابچے منظر عام پر آئے تھے[3]

چرچ اور اسٹیٹ کی اس لڑائی میں فتح مندی کا سہرا کلیسا کے ہاتھ رہا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی تک پاپائیت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی[4] چودھویں صدی کے آتے آتے یورپ میں قومی بادشاہتوں نے زور پکڑنا شروع کیا اور نظام جاگیرداری، جبکہ بڑی حد تک یہی ادارہ کلیسا کے زور اور قوت کا ذریعہ تھا، دن بدن کمزور پڑتا گیا[5]۔ اسی عرصے میں مختلف اسباب کے تحت یورپ میں روشن خیالی (Enlightment) اور نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریکات نے اپنے اثرات دکھلانے شروع کئے۔ عوام الناس کے ذہن و فکر میں بیداری آئی، سماج میں فرد کی اہمیت کا احساس فزوں تر ہونے لگا اور لوگ بے چون و چرا کلیسا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہ تھے نتیجے کے طور پر وہاں میکاؤلی (Machia-velli (1469-1527) جیسے مفکرین منظر عام پر آئے جنھوں نے براہ راست "مذہب و اخلاق"

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حوالہ سابق صفحات ۹۲ تا ۱۱۳

[2] حوالہ مذکور صفحہ ۱۱۱ ، [3] حوالہ سابق/ ۱۲۶ [4] کتاب مذکور/ ۸۵ [5] حوالہ سابق/ ۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے 'سیاست' کی علاحدگی کا علم بلند کیا۔ اس کے بعد اگرچہ لوتھر (Luther) کی سولہویں صدی کی اصلاح (Reformation) کی تحریک نے ایک بار پھر مذہب اور اسٹیٹ کو ایک ساتھ جوڑنا چاہا، جس کے لئے اس نے موجود الوقت پاپائیت کو مسترد کرتے ہوئے 'بادشاہوں کے ابدی حق' (Divine Right of Kings) کا نعرہ لگایا اور 'خدا کے مقرر کردہ شہزادوں کی خاموش اطاعت' (Passive obedience to the godly Princes) کی تلقین شروع کی، لیکن مسیحی اقتدار سے یورپ اس قدر عاجز آچکا تھا کہ 'قومی بادشاہتوں' کے ذریعہ مسیحیت کے بالواسطہ اقتدار کے بوجھ کو بھی وہ اب زیادہ دن تک اٹھانے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں دعویٰ کیا کہ 'اقتدار کا سرچشمہ بادشاہ نہیں ملک کے عوام' ہیں حکومتِ وقت کو ان کی مرضیات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اور معاملات زندگی کی تنظیم اس ڈھنگ سے ہونی چاہیئے جیسا کہ کسی ملک کے عوام کی خواہش ہو۔ چنانچہ مذکورہ تحریک اصلاح کے خلاف خود محاذ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آگے اٹھارویں صدی تک خاص طور پر ہابس، لاک اور روسو جیسے مفکرین منظر عام پر آئے جنھوں نے میکاؤلی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مذہب و اخلاق کو ریاست کے تابع قرار دیا۔ اور 'بادشاہوں کے ابدی حق' (Divine Right of Kings) کے برخلاف سماجی معاہدہ (Social Contract) عوام کے اقتدار اعلیٰ (Sorty of People) اور خواہش عام (General Will) کا تصور پیش کیا جس کا خلاصہ تھا کہ حکومت 'کہ ادارہ' بذاتِ خود اقتدار کا مالک نہیں۔ اقتدار کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔ حکمران اور عوام کے درمیان ایک طرح کا سماجی معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت کوئی حکومت وجود میں آتی ہے۔ اس لئے اسے عوام کی مرضیات کی آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جس سے خلاف ورزی کی صورت میں وہ اپنے حق بقاء سے محروم ہو جاتی ہے۔ نیز یہ کہ 'مسیحیت' کسی صورت حکومت و سیاست کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یہ خاص طور پر انہی لوگوں کے افکار کا نتیجہ تھا جو ۱۶۸۸ء میں انگلینڈ اور ۱۷۷۶ء میں امریکہ اور ۱۷۸۹ء میں فرانس کے انقلابات وجود میں آئے۔ جن میں آخری طور پر 'بادشاہتوں' کے خاتمہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر سرزمین یورپ سے مسیحیت کے اقتدار کا خاتمہ عمل میں آیا[۱]۔ اور معاملات دنیا

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ڈی۔ آر بھنڈاری کی کتاب مذکور صفحات ۱۳۱ تا ۲۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بے دخل کرتے ہوئے مذہب کو فرد کی نجی زندگی پر قانع ہونے کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ اور انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ دستوری سطح پر یہ بات منظر عام پر آئی کہ مذہب کا معاملات دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اسے اگر جینا ہے تو اس دائرے کے باہر ہی وہ زندہ رہ سکتا ہے چنانچہ ان انقلابات کے نتیجے میں جو تحریری دستاویزات سامنے آئیں ان میں اگرچہ خالق کائنات (Creater) خدا تعالی (Prudence) اور اعلی تر ہستی (Supreme Being) کے الفاظ موجود ہیں لیکن اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ معاملات دنیا کے سلسلے میں اب 'مذہب' کے لئے کوئی احترام نہیں رہے گا نیز یہ کہ اقتدار کا اصل سرچشمہ دراصل قوم ہوا کرتی ہے۔[1]

بلنچلی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'دستوری آف اسٹیٹ' میں 'ریاست' سے تعلق رکھنے والے بعض اہم مسائل کے سلسلے میں قرون وسطی اور عہد جدید میں ان کے مابین پائے جانے والے فاصلے کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے جس کے ذریعہ موجودہ دور میں 'مذہب کی معاملات دنیا سے بے دخلی' کے رائج الوقت تصور کے پس منظر کو کافی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ذیل میں اس کے بعض اہم عنوانات کو اسی نقشہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں:-

قرون وسطی	عہد جدید
۱۔ ریاست کا تصور	
قرون وسطی میں ریاست اور	جدید دور میں ریاست کا وجود
ریاست کے اختیار کو براہ راست	انسانی ذرائع کا رہین منت ہے اور
خدا سے حاصل کردہ تصور کیا جاتا تھا۔	اس کی بنیاد تمام تر انسانی فطرت
ریاست کی حیثیت ایک ایسی تنظیم	پر ہے۔ ریاست ایک مشترک زندگی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھی جائیں: امریکہ کا ۱۷۷۶ء کا آزادی کا اعلامیہ، ۱۷۹۱ء کا امریکی حقوق کا بل اور ۱۷۸۹ء کا حقوق شہریت وانسانی کا فرانسیسی اعلامیہ کی مختلف دفعات بحوالہ J.S. Schapiro: Liberalism Its meaning and History صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تھی جو خدا کی مرضی کی آئینہ دار اور اس کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھی۔

۲۔ دینیات اور سائنس

ریاست کے تصور کی بنیاد مذہبی اصولوں پر تھی اور اسی کی طاقت سے اس کی پوری مشینری حرکت کرتی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں اگرچہ مسیحیت چرچ اور اسٹیٹ کی ثنویت کی قائل تھی لیکن اس کا اعتقاد تھا کہ یہ دونوں ہی تلواریں یعنی روحانی اور دنیوی، خدا کی تفویض کردہ ہیں ایک کو اس نے پوپ کے حوالہ کیا ہے اور دوسرے کی ذمہ داری شہنشاہ (Emperor) کو سونپی ہے۔ پروٹسٹنٹ اسکول دینیات نے روحانی تلوار کے تصور کو مسترد ضرور کیا اور صرف ایک تلوار یعنی ریاست کو قابلِ قبول ٹھہرایا لیکن اس مذہبی خیال کو وہ مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ خدا کی طرف سے آتا ہے۔

کی تنظیم سے عبارت ہے جس کی تشکیل انسانی ہاتھوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے اور اس کا انتظام بھی انہی کے ذریعہ چلتا ہے۔ اور یہ چیز تمام تر انسانی مقاصد کے گرد گھومتی ہے۔

ریاست کے بنیادی اصولوں کی راہ انسانی علوم یعنی فلسفہ اور تاریخ متعین کرتے ہیں موجودہ علم سیاسیات ریاست کی تعبیر و تشریح میں اصلاً انسان کا اعتبار کرتا ہے۔ وہ اپنے سفر کا آغاز بھی اسی نقطہ سے کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ریاست افراد کے اس اجتماع سے عبارت ہے جو آپس میں اس لئے متحد ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنا تحفظ اور اپنی آزادی کا دفاع کر سکیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو بحیثیت مجموعی اسے پوری قوم کی امنگوں کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ ریاست کا جدید نظریہ مذہبی نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ بالکل لامذہبی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ریاست کا دار و مدار مذہبی عقیدے پر نہیں ہونا چاہئیے۔ یہ اس کا انکار نہیں کرتا کہ خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے اور یہ جو دنیا کا نظام چل رہا ہے اس میں اس کی قدرت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ موجودہ علم سیاسیات کا وظیفہ یہ نہیں کہ خدائی طور طریقوں کے سمجھنے میں اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوت صرف کرے، وہ ریاست کو ایک 'انسانی ادارے' کی حیثیت سے سمجھنا چاہتا ہے۔

۳۔ تھیاکریسی (مذہبی مستبدانہ حکومت)

عہد وسطیٰ میں ریاست کا تصور بالکل پرانے دور کے انسانوں کی طرح براہ راست تھیاکریسی کا تو نہ تھا۔ البتہ وہ بالواسطہ تھیاکریسی (مذہبی مستبدانہ حکومت) کا قائل تھا بیچ کی کڑی یعنی حکمراں خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ ہوتا تھا۔

جدید اقوام کے سیاسی شعور کے لئے تھیاکریسی اپنی جملہ صورتوں کے ساتھ صد درجہ ناگوار ہے۔ عہد جدید کی ریاست ایک انسانی اور دستوری انتظام سے عبارت ہے۔ ریاست کا اختیار عوامی قانون کے ہاتھوں بندھا ہوا ہے اور ریاست کا منتہائے مقصود قوم کی فلاح ہے۔ البتہ یہ تمام چیزیں انسانی فہم سے اخذ کردہ ہیں اور انھیں انسانی ذرائع ہی سے روبہ عمل لایا جائے گا۔

۴۔ مذہب

قرون وسطیٰ میں ریاست کا تمام تر انحصار ہم مذہب جماعات و افراد پر تھا۔ اور اس کا مطالبہ تھا کہ ہر جگہ عقیدے کی یکسانی رہے۔ کافروں اور بے دینوں کے لئے اس زمانے میں کوئی سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ ان پر مختلف طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے اور انھیں طرح طرح سے ستایا جاتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر انھیں فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ بہتر سے بہتر سلوک جس کی ان کے ساتھ توقع رکھی جا سکتی تھی وہ یہ کہ ان کے وجود کو انگیز کر لیا جائے۔

موجودہ دور میں کسی شخص کو قانونی طور پر کوئی مرتبہ و مقام عطا کرنے کے لئے ریاست مذہب کو ایک شرط لازم تصور نہیں کرتی۔ فرد اور سماج ان دونوں سے تعلق رکھنے والے قوانین مذہب اور عقیدے کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عہد جدید کی ریاست عقیدے کی آزادی کا تحفظ کرتی اور مختلف چرچوں اور مذہبی سوسائٹیوں کو ایک لڑی میں پرو کر رکھتی ہے۔ البتہ مذہب سے بیزار یا کسی بھی بے عقیدہ شخص کے سلسلے میں وہ کسی قسم کی ظلم و زیادتی اور اس کی ایذا رسانی کو کسی بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انداز سے جائز تصور نہیں کرتی۔[1]

اس موازنے کی روشنی میں عہد جدید کے انسان کی نظر میں مذہب کی حیثیت، اس کے مرتبہ و مقام نیز زندگی کی دوڑ میں اس کی واقعی جگہ کے سلسلے میں اس کے نقطۂ نظر کو باحسن وجوہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح قرون وسطیٰ میں چرچ اور اسٹیٹ کی کشمکش کے نتیجے میں وہاں 'مذہب' کے سلسلے میں ایک خاص نقطۂ نظر پروان چڑھا اور بعد میں آہستہ آہستہ اس نے مسیحیت سے آگے فی الجملہ 'مذہب' ہی کے سلسلے میں ایک عام تصور کی حیثیت اختیار کر لی، جس کا انتہائی مقام یہ ہے کہ وہ زندگی میں ایک عضو معطل کی حیثیت سے تو باقی رہ سکتا ہے البتہ اس کے لئے سماج میں کسی موثر کردار کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یورپ کی تاریخ میں ایک طویل عرصے تک مذہب اور چرچ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کئے رہے، بعد میں چرچ کا نظام کمزور ہونے کے بعد یہ مقام وہاں کے 'بادشاہوں' کو حاصل ہو گیا اور وہ روئے زمین پر 'مذہب' کا عملی مظہر قرار پائے۔ بادشاہوں نے چرچ کو بے دخل کر کے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو معاملہ پھر بھی غنیمت رہا اس لئے کہ اول الذکر کی طرح یہ بھی اپنے تئیں مذہب کی نمائندگی کے مدعی تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں جب مذہب سے بیزار بلکہ اس سے عاجز عوام نے ان 'بادشاہوں' کی بساط الٹی تو بادشاہوں کے خاتمہ اور ان کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ یہ چیز اس مذہب کی بے دخلی اور اس کے خاتمہ کا بھی موجب بنی جو اپنے کو اٹوٹ طور پر ان بادشاہوں سے جوڑے ہوئے تھا۔ یورپ کا ستم یہ ہے کہ پہلے تو اس نے ایک نامکمل مذہب سے جس کے چہرے کو انسانی تحریفات نے بری طرح داغدار کر رکھا تھا، اپنے کو جوڑے رکھا لیکن اس سے بڑی ستم ظریفی اس کی یہ ہے کہ مختلف اسباب کے تحت جب وہ اس مذہب سے عاجز آ گیا تو اسے مسترد کرنے کے ساتھ ہی اس نے نفس مذہب کے سلسلے میں ایسا دھواں دار پروپیگنڈہ شروع کیا کہ کہنا چاہئے کہ دنیا کے بیشتر مذاہب کے ماننے والے اس کی لپیٹ میں آ گئے اور اپنے اپنے مذاہب کو بھی انھوں نے اسی چوکھٹے کا پابند بنا لیا جس کی وکالت سرزمین یورپ کے فرزانوں کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: The Theory of the State. P. 60-62

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف سے کی جارہی تھی یعنی یہ کہ 'مذہب انسان کی پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے، معاملات دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہے نہ ہونا چاہیئے' یہاں تک کہ اہل یورپ کے نزدیک مذہب (Religion) کی تعریف ہی اس دائرے میں محصور ہو کر رہ گئی کہ "مذہب نام ہے اس محسوس عملی تعلق کا جو کسی ایک یا متعدد مافوق الفطری وجود یا وجودوں پر اعتقاد کی صورت میں کسی فرد کا اس سے یا ان سے قائم ہوتا ہے"[1]

ہم مبارکباد دیتے ہیں یورپ کو اس کی اس ہوشیاری اور چالاکی پر کہ اس نے جب اپنی ناک کاٹی تو اس کے فضائل اس زور وقوت کے ساتھ بیان کئے کہ دنیا کی عظیم آبادی نے اپنے لئے 'نکٹا' ہونے ہی کو باعث افتخار سمجھا اور ہر اس شخص کو الٹا عار دلانے لگی جو کسی بھی صورت اپنے لئے 'ناک والا' رہنے کا قائل اور اس کی وکالت کرنے والا اور اس کا مؤید نظر آتا ہو۔

لیکن خاص طور پر آج کے روشن خیال اور آزادیٔ فکر ونظر کے مدعیوں سے ہمارا یہ سوال اب بھی قائم ہے کہ کیا یورپ کے اپنے اس محدود تلخ تجربے کے نتیجے میں نفس مذہب کے سلسلے میں اس کا مذکورہ بالا اعلان واظہار کسی بھی درجے میں حق وصداقت کا آئینہ دار ہے۔ اور کیا اس کی پیروی میں کسی بھی دوسری سمت سے اس طرح کے کسی اظہار واعلان کو مبنی بر حقیقت اور حق وانصاف کا تقاضا قرار دیا جاسکتا ہے۔؟

---

[1] رابرٹ۔ ایچ۔ تھولس (Robert . H. Thouless) نے پروفیسر لیوبا (Leuba) کی کتاب 'A Psychological Study of Religion' کے حوالہ سے مذہب کی اڑتالیس ۴۸ تعریفوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خاص طور پر صرف تین تعریفوں کی طرف توجہ کی ہے۔ اور پھر ان سب کا خلاصہ وہ بیان کیا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ ملاحظہ ہو:۔

Robert . H. Thouless : The Psychology of Religion P. 4.

اپنے معاونین سے

ادارہ کا اکاؤنٹ IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-E-ISLAMI, ALIGARH کے نام سے ہے۔ براہ کرم اپنا چیک یا ڈرافٹ اسی نام سے بھیجیں۔ اس میں کسی لفظ کی کمی بیشی سے زحمت ہوتی ہے۔ امید ہے آپ کا تعاون ہمیں مستقل حاصل رہے گا۔ (مینیجر)

© rasailojaraid.com